ریاض رحمانی

حضرت امیر شریعت

برادرِ عزیز و محترم مولانا سید عطاء المحسن بخاری سلمہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کے والدِ گرامی قدر اور اپنے مرشد و پیشوا حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اپنی یاداشتیں سپردِ قلم کریں۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

قدرت نے شاہ جی کو بیشمار کمالات سے نوازا تھا۔ جس زمانے میں برصغیر ہند ان کی بےمثال خطابت کے زمزموں سے گونج رہا تھا وہ دور اس خطۂ ارض کا تابناک دور تھا۔ ان دنوں زندگی کے ہر شعبے میں بلا امتیاز مذہب وملت ایسے ایسے نابغۂ روزگار لوگ موجود تھے جن پر یہ دھرتی ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔ ہم بلا تامل عرض کر سکتے ہیں کہ گذشتہ ایک ہزار سال میں بیک وقت اتنے باکمال لوگ شاید ہی کہیں پیدا ہوئے ہوں مگر شاہ جی اس زمانے میں بھی سب سے انوکھے اور سب میں منفرد تھے۔ ان کو قدرت نے جس شانِ محبوبیت و مقبولیت سے سرفراز فرمایا تھا وہ کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوئی۔ ہر طرف ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا اور پورے ہندوستان میں ان کے چاہنے والے موجود تھے۔

ہم نے ایک اچھا خاصا وقت ان کے قدموں میں رہ کر گذارا اور ان کی رفاقت میں دور دراز کا سفر کیا۔ ہم جہاں بھی گئے ان کے دیوانوں کی کمی کہیں محسوس نہ ہوئی۔ شاہ جی کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ کسی جنگل میں بھی ان کی تقریر کا اعلان ہوجاتا تو جنگل میں منگل کا سماں بندھ جاتا۔ وہ جس جلسہ میں شریک ہوتے وہاں کسی بھی بڑے سے بڑے خطیب اور عالم دین کا چراغ نہ جل پاتا۔ ان کا وجود ایسی شمع فروزاں کی طرح تھا جس پر نثار ہونے کے لئے پروانے سینکڑوں میل سے کھنچے چلے آتے۔ کبھی کبھی ان کی یہ مقبولیت خود ان کے لئے پریشانی و پشیمانی کا سامان بن جاتی۔ غالباً ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے بہاولپور میں مجلس حزب اللہ اور جمیعۃ المسلمین کا جلسہ تھا۔ شاہ جی کے علاوہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ، موجود تھے۔ حضرت مدنی تقریر فرما رہے تھے کہ شاہ جی بھی احتراماً حضرت کا بیان سننے کے لئے جلسہ گاہ میں چلے آئے۔ آپ جونہی سامنے آئے لوگوں نے زندہ باد کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا او تقریر کا مطالبہ شروع کر دیا۔ ادھر شاہ جی شرم و ندامت کے احساس سے پانی پانی ہو رہے تھے، ادھر حضرت مدنی حیران و پریشان تھے۔ ان کے مزاج کا دھیمہ پن خاصا مشہور تھا مگر وہاں ان سے ضبط نہ ہوسکا اور غصے میں آکر فرمانے لگے کہ جن

جلسوں میں شاہ صاحب موجود ہوں وہاں ہم لوگوں کو بلا کر ہماری توہین کرانا مناسب نہیں ہے، جب شاہ جی رہائش گاہ پر واپس آئے تو کافی دیر تک فکر مندی اور دل گرفتگی کی حالت میں مہر بلب بیٹھے رہے۔

غالباً یہ سن بیالیس کے آخر یا تینتالیس کے ابتدائی دنوں کی بات ہے، لاہور میں آل انڈیا جمیعتہ العلماء کانفرنس ہو رہی تھی۔ امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد بھی خاص دعوت پر تشریف لائے تھے۔ ریلوے اسٹیشن پر ان کے فقید المثال استقبال کا منظر آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ جس نشست میں حضرت امام الہند کا خطاب تھا اس میں شاہ جی بھی موجود تھے اور حضرت کی کرسی کے بالکل قریب دوزانو بیٹھے پورے انہماک سے تقریر سن رہے تھے۔ امام الہند کی تقریر کیا تھی، فصاحت و بلاغت کا ایک سیل رواں تھا مگر اچانک جلسہ گاہ کے مختلف حصوں سے بخاری۔ بخاری کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ جب شور کچھ بڑھا تو حضرت نے اپنا بیان روک دیا اور حیرت و استعجاب کے ساتھ حاضرین کو تکنے لگے۔ اتنے میں شاہ جی دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور مولانا آزاد سے عرض کیا کہ حضرت ان جاہل لوگوں کی گستاخی کی میں معافی مانگتا ہوں لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو خاموش ہو گئے۔

کمال تو یہ ہے کہ آپ کے ساتھ محبت و شیفتگی کی اس کیفیت میں سب لوگ یکساں مبتلا تھے اس سلسلہ میں علماء، وکلاء تعلیم یافتہ، ان پڑھ شہری یا دیہاتی میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ اس دور میں مجلس احرار اسلام کی صفوں میں خطابت کے ایسے ایسے شہسوار موجود تھے جن کی مثال ملنا ناممکن ہے۔ قاضی احسان احمد، شورش کاشمیری، مولانا گلشیر، صاحبزادہ فیض الحسن، شیخ حسام الدین کے علاوہ متعدد دوسرے رہنما تھے مگر شاہ جی کی مقبولیت کو کوئی نہ چھو سکا بلکہ یہ سب خود بھی ان کے حلقۂ ارادت و محبت میں شامل تھے۔ حتیٰ کہ لاکھوں کروڑوں ہندو بھی آپ کے عقید تمند تھے۔ خیر پور میں ڈاکٹر رگھناتھ رائے بہت لکھے پڑھے اور سرد و گرم چشیدہ انسان تھے۔ مقامی ہندو سبھا کے جنرل سیکرٹری تھے۔ انہوں نے رات کو شاہ جی کی تقریر سنی تو اگلے روز ہم سے کہا کہ میں نے زندگی میں یہ واحد خطیب دیکھا ہے جو اپنی تقریر کے دوران پہلے خود مستی میں آتا ہے اور پھر سامعین کو مست و بیخود بنا دیتا ہے۔

جب سے سابق ریاست بہاولپور کی عدالت نے مرزائیوں کو کافر قرار دیا شاہ جی بہاولپور والوں سے بہت محبت کرنے لگے۔ جلسوں میں آتے تو مزید دو تین روز کے لئے یہاں ٹھہر جاتے۔ شاہی بازار میں واقع مجلس حزب اللہ کے دفتر میں خوب محفلیں سجتیں۔ ایک دن فرمانے لگے کہ بہاولپور کے علماء خصوصاً جامعہ عباسیہ کے مدرسین چھپ چھپا کر ملنے آتے ہیں اور رات کی تاریکیوں کی آڑ لیتے ہیں کیا حکومت سے ڈرتے ہیں؟ ہم نے عرض کیا کہ حضرت یہ لوگ مولانا غلام محمد گھوٹوی شیخ الجامعہ سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ آپکو پسند نہیں کرتے یہاں تک کہ مدرسین اور طلبہ کو منع کر رکھا ہے کہ وہ آپ کی تقریر بھی نہ سنا کریں بلکہ انہوں نے راقم الحروف کو جامعہ عباسیہ سے نکلنے پر اسی لئے مجبور کر دیا تھا کہ ہمارا آپ سے تعلق خاطر ہے۔ یہ سننا تھا کہ شاہ جی نے کپڑے تبدیل کئے، کلہاڑی ہاتھ میں لی اور جامعہ عباسیہ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ ہم نے

راستے میں بہت روکا مگر وہ کب کسی کی ماننے والے تھے۔ جب ہم دونوں مدرسے کے صدر دروازے میں داخل ہوئے اور مدرسین و طلبہ نے دیکھا تو دنگ رہ گئے، ہمارے بعض سابق اساتذہ نے ہمیں گھور کر دیکھا اور خفگی کا اظہار کیا کہ ہم نے یہ کیا حماقت کی ہے کہ شاہ جی کو ساتھ لے کر مدرسہ میں پہنچ گئے۔ حضرت شیخ الجامعہ دارالحدیث میں بڑے سے تخت پر بیٹھے طلبہ کو سبق پڑھا رہے تھے ان میں گولڑہ شریف کے موجودہ سجادہ نشین حضرت معین الدین، ان کے برادر خورد حضرت شاہ عبدالحق، ان کے ایک خدمت گار رفیق حافظ خدا بخش اور حضرت مولانا فاروق احمد کے صاحبزادے مولانا محمد احمد بھی شامل تھے کہ شاہ جی نے اچانک کمرے میں داخل ہو کر السلام علیکم کہا اور حضرت شیخ کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ جونہی شیخ الجامعہ صاحب نے مڑ کر دیکھا بوکھلا گئے۔ جسم پر کپکپی طاری ہو گئی، غصے میں صرف اتنا کہہ سکے کہ تم تم تم..... یہاں کیوں آئے ہو؟ شاہ جی نے کمال اطمینان سے جواب دیا کہ میں ان آنکھوں کو دیکھنے آیا ہوں جنھوں نے حضرت مہر علی شاہ صاحب کو دیکھا ہوا ہے۔ بس پھر کیا تھا حضرت شیخ اچھلے اور تخت سے نیچے گر کر مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔ کافی دیر تک یہ کیفیت طاری رہی پھر سنبھلے اور اٹھ کر شاہ جی کا منہ جسم اور ہاتھ چومنے لگے۔ جب انہیں کچھ قرار آیا تو شاہ جی اٹھے اور السلام علیکم کہہ کر وہاں سے روانہ ہو گئے صحن اور برآمدے میں مدرسین اور طلبہ جو اس ڈر سے سہمے ہوئے تھے کہ ابھی کوئی دھماکہ ہو گا واپسی پر ہم دونوں کو ہنستا مسکراتا دیکھا تو انہیں کچھ اطمینان نصیب ہوا۔ راستے میں شاہ جی ہم سے فرمانے لگے کہ دیکھا حضرت شیخ کو کیسا تڑپایا ہے۔

یہ کم لوگوں کو علم ہو گا کہ حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی رحمۃ اللہ علیہ کو درسگاہ سے نکال کر خطابت اور سیاست کے میدان میں لانے کا سہرا بھی شاہ جی کے سر ہے ورنہ زندگی کا بیشتر حصہ انہوں نے درس و تدریس میں گذارا۔ ابتداء میں کبھی کبھار جلسوں میں وہ مختصر خطاب کیا کرتے تھے مگر تقریر کے دوران مسلسل و متواتر احادیث پڑھنے کا انداز دیکھ کر شاہ جی نے ان سے کہا کہ آپ بیشک درس کا سلسلہ جاری رکھیں مگر جلسوں میں ضرور شرکت فرمایا کریں بلکہ ضلع رحیم یار خان سے جب کبھی آپکو کسی جلسے کی دعوت ملتی منتظمین کو ہدایت کرتے کہ مولانا درخواستی کو ضرور مدعو کیا جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ مستقبل میں قدرت نے ان سے جو کام لینا تھا شاہ جی کو اس کا ذریعہ بنایا۔ یہ آپکا معمول تھا کہ جب کہیں کوئی جوہر قابل دیکھتے اسے ترغیب دے دلا کر منبر کے راستے اسٹیج تک کھینچ لاتے۔ حضرت مولانا محمد علی جالندھری، مولانا محمد شریف بہاولپوری اور مولانا عبدالرحمن میانوی رحمۃ اللہ علیہم کے علاوہ اور بھی کئی شخصیات ہیں جو آپ کے توسط سے شہرت و مقبولیت کی بلندیوں تک پہنچیں۔ ہمیں یاد ہے جب عام خاص باغ میں منعقدہ ایک احرار کانفرنس میں شاہ جی نے خود مولانا محمد علی جالندھری کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ میں جالندھر سے ملتان کے لئے ایک ایسا تحفہ لایا ہوں جو ایک دن ملتان کی شناخت بن جائے گا۔

یہ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہے۔ ان دنوں ہم صرف نہو کی درسی کتابوں کے طالب علم تھے کہ خیر پور ٹامیوالی میں شاہ جی تشریف لائے۔ ساوی مسجد میں آپ نے خطبۂ جمعہ دیا اور نماز کے بعد خطاب فرمایا

یہ تقریر نہ صرف خیر پور والوں کے لئے بلکہ خود شاہ جی کے لئے بھی یادگار تھی جو اس وقت ختم ہوئی کہ اگر دس پندرہ منٹ مزید جاری رہتی تو عصر کا وقت ٹل سکتا تھا۔ رہائش گاہ پر پہنچنے کے بعد ملاقاتیوں نے اس تقریر کی تعریف کی تو شاہ جی نے فرمایا کہ آج عجیب کیفیت تھی نہ صرف دل و دماغ حاضر تھے بلکہ ایک خاص قسم کا جذبہ تھا جو بے اختیار بولنے پر مجبور کر رہا تھا۔ محترم سید غلام محی الدین شاہ صاحب ہمدانی بولے کہ حضرت اس مسجد کا سنگ بنیاد حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے رکھا تھا اس پر شاہ جی بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ الحمدللہ ہمارے بزرگوں کی روحانی برکتیں ہم پر ہر وقت سایہ فگن ہیں۔

خیر پور کے حوالے سے یاد آیا کہ یہاں شاہ جی کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ آپ یہاں تشریف لاتے تو کئی کئی روز تک قیام پذیر رہتے۔ راقم الحروف کے علاوہ برادرم سید عباس علی شاہ ہمدانی مرحوم، برادرم حکیم نصیر الدین اور بعض دوسرے احباب کے ہاں دعوتیں ہوتیں اور شاہ جی کی بزم آرائیاں جاری رہتیں۔ ایک مرتبہ راقم الحروف کی والدہ ماجدہ مرحومہ نے اعلیٰ درجہ کی کستوری دے کر ہمیں ہدایت کی کہ ہم شاہ جی کو پیش کریں آپ یہ تحفہ وصول کر کے بے حد خوش ہوئے۔ بار بار اس کی خوشبو سونگھتے اور سبحان اللہ پڑھتے رہے۔ آپ فرمایا کرتے کہ خوشبو میری کمزوری ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ شاہ جی کو خوشبو بہت پسند تھی اور بدبو سے اتنی نفرت تھی کہ ہلکی سی بدبو بھی خاطر پر ناگوار گذرتی۔ گھوڑے کی سواری بے حد پسند تھی۔ سب موسموں میں آپکو برسات کا موسم بہت پسند تھا۔ ساون بھادوں کے مہینہ میں دل کھول کر نہاتے رہتے اس دوران اگر نماز کا وقت ہو جاتا تو برستے مینہ میں تہبند کے ساتھ نماز ادا کرتے البتہ بادل کی زبردست گھن گرج اور بجلی کی چمک سے بہت ڈرتے تھے ادھر بجلی چمکتی ادھر لپک کر کمرے کے اندر چلے جاتے (حضور علیہ السلام بھی ایسی کیفیت میں پریشان ہو جاتے تھے اور اللہ سے رحمت کی دعا مانگتے تھے) شاہ جی کی اس کمزوری کو دیکھ کر ان کے تمام دوست حیران رہ جاتے۔

شاہ جی سراپا محبت و اخلاص تھے انہیں مذہب و ملت اور رنگ و نسل کی بنیاد پر کسی بھی انسان سے نفرت نہ تھی۔ فرماتے تھے کہ میں صرف انگریز اور مرزائی سے نفرت کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ہندو آپ کے حلقہ احباب میں شامل تھے۔ اس سلسلہ میں ایک ہندو پروفیسر سے ملاقات کا واقعہ سنئیے۔ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے مترجم قرآن مجید میں اسم "صمد" کا ترجمہ نرادھار کیا ہے۔ شاہ جی فرماتے تھے کہ انہوں نے بہت جستجو کی مگر کوئی بھی اس لفظ کا مفہوم نہ سمجھا سکا۔ جیل میں آپ کی ملاقات ایک ماہر لسانیات سے ہوئی وہ شخص ہندوستان کی قدیم زبانوں کا سکالر تھا۔ آپ نے جب یہ سوال اس پروفیسر سے کیا تو وہ حیرت سے آپ کا منہ تکنے لگا۔ بولا کہ آپکو یہ لفظ کہاں سے ملا۔ بہر حال پروفیسر مذکور نے وضاحت کی کہ جو اپنے کسی کام میں کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو، اور جس کی مدد کے بغیر کسی کا کوئی کام

انجام نہ پا سکے اسے نرا دھار کہتے ہیں۔ فرمایا کہ پروفیسر مذکور کے ساتھ جیل میں قید کی مدت بڑی آسانی سے کٹی کیونکہ اس کے ساتھ ہر وقت علمی ادبی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ ایک مرتبہ آپ دہلی تشریف لے گئے رات کو شاہی قلعہ کے سامنے جلسہ گاہ میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ حاضرین و سامعین کا اتنا ہجوم تھا کہ ہم نے اس سے قبل اتنا بڑا مجمع کبھی نہ دیکھا تھا۔ یوں محسوس ہوتا کہ پورا شہر امڈ آیا ہے۔ شاہ جی نے اپنے مخصوص انداز میں خطاب فرمایا اور دہلی والوں کے دل لوٹ لئے۔ جامع مسجد کے قریب ہی دوسری منزل پر مجلس احرار اسلام کا دفتر تھا۔ جہاں آپ کا قیام تھا۔ دن میں کسی بھی وقت روانگی تھی مگر دفتر کے نیچے ہلچل مچ گئی۔ پتہ چلا کہ محترم بیرسٹر آصف علی اور بیگم ارونا آصف علی آئے ہیں۔ دونوں پوری نیازمندی کے ساتھ آپ سے ملے اور کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ دفتر کے انچارج میاں عبدالستار نے مہمانوں کی خود تواضع کی۔ پتہ چلا کہ رات کو دونوں میاں بیوی موٹر میں بیٹھ کر شاہ جی کی تقریر سنتے رہے تھے اور بیگم صاحبہ کی خواہش پر ملاقات کے لئے آئے تھے۔

آپکو قدرت نے خطاب و بیان کی ایسی صلاحیتیں عطا کی تھیں کہ سامعین مسحور ہو کر رہ جاتے۔ حسن بیان کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہتا۔ بہاولپور کی پرانی جامع مسجد کے صحن میں جلسہ تھا رات کو ایک گھنٹہ تک قاضی احسان احمد صاحب کا بیان ہوا علامہ انور صابری کی نظم کے بعد شاہ جی کی تقریر شروع ہوئی۔ کسی کو ہوش نہ رہا کہ کتنا وقت گذر چکا ہے کہ اچانک جامع مسجد کے مرحوم مؤذن احمد بخش کی آواز گونجی اللہ اکبر اللہ اکبر تب جا کر پتہ چلا کہ رات بیت چکی ہے۔ شاہ جی نے اپنے مخصوص لحن و لہجے میں ترنم کے ساتھ یہ شعر پڑھا

دی مؤذن نے اذاں وصل کی شب پچھلی رات
ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

شاہ جی اپنی تقریر کے دوران موزوں و مناسب شعر ایسے موقع پر چست کرتے کہ حاضرین و سامعین بار بار فرمائش کر کے وہی شعر سنتے۔ ہمیں یاد ہے جب مجلس احرار اسلام نے برصغیر میں منعقد ہونے والے آخری عام انتخابات (۱۹۴۶ء) میں حصہ لینے کا اعلان کیا تو شاہ جی اپنی اہلیہ محترمہ کے ہمراہ جو ان دنوں علیل تھیں کشمیر میں قیام فرما تھے اور جماعت کے اس فیصلے سے ناراض بھی تھے۔ امرتسر مسلم لیگ کا انتخابی جلسہ ہوا جو بہت زور دار تھا۔ میاں افتخار الدین نے تقریر کی وہ اس زمانے میں کانگریس کو چھوڑ کر پنجاب مسلم لیگ کی صدارت قبول کر چکے تھے انہوں نے اپنی تقریر میں یہ الزام لگایا کہ احرار کانگریس کے تنخواہ دار ایجنٹ ہیں۔ جن دنوں وہ صوبہ پنجاب کانگریس کے صدر تھے ان لوگوں کو اپنے ہاتھ سے تنخواہ ادا کیا کرتے تھے۔ ان کے اس الزام نے پورے شہر میں آگ لگا دی۔ گلیوں بازاروں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ احرار رضاکار بے حد مایوس و ملول ہو چکے تھے۔ کہ شیخ حسام الدین اور مولانا مظہر علی اظہر نے آغا شورش کو کشمیر بھیجا کہ وہ

صورت حال کی سنگینی سے آگاہ کر کے اور شاہ جی کو منا کر اپنے ہمراہ واپس لائیں۔ آغا صاحب شاہ جی کو واپس لانے میں کامیاب ہو گئے جماعت نے اپنا پہلا انتخابی جلسہ امرتسر میں کیا۔ شیخ صاحب نے صدارت فرمائی شاہ جی نے اس روز تاریخی تقریر کی۔ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جلسہ گاہ میں موجود تھا جب آپ نے میاں افتخار الدین کے الزام کا ذکر کیا تو یہ شعر پڑھا

حضرت زاہد نے مئے پی کر یہ اچھی چال کی
محتسب سے جا ملے رندوں کے مخبر ہو گئے

یقین کیجئے اس شعر نے جادو کا اثر دکھایا۔ کئی غمزدہ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں، کئی لوگ قہقہے لگا رہے تھے، کچھ لوگ شعر کی معنویت کی داد دے رہے تھے اور کچھ لوگ اس کے بر محل استعمال پر دادو تحسین کے ڈونگرے برسا رہے تھے۔ لوگوں نے بار بار فرمائش کر کے سات مرتبہ یہ شعر پڑھوایا۔ اگلے روز میاں صاحب کے الزام کی دھجیاں بکھر چکی تھیں اور جگہ جگہ شاہ جی کی معرکتہ الارا تقریر کے چرچے ہو رہے تھے۔

شاہ جی کو عوام کی نفسیات کا پورا پورا ادراک تھا خود فرماتے تھے کہ میں لوگوں کی آنکھوں سے تقریر کے لئے موضوع تلاش کرتا ہوں۔ تقریر کے دوران اپنے مقربین کو اپنے سامنے بٹھاتے تھے۔ فرمایا کرتے کہ "یتلو علیہم میں شامل ہو کر بیٹھو۔ تقریر سے قبل چند لمحوں تک کچھ پڑھتے پھر دائیں ہتھیلی پر پھونک کر چہرے پر ہاتھ پھیرتے اس کے بعد مجمع پر نظر جو ڈالتے تو دلوں کو کھینچ لیتے ہم اور ہم جیسے آپ کے نیاز مندوں نے بہت پوچھا کہ آپ اس دوران کیا پڑھتے ہیں تو ہنس کر ٹال جاتے۔ ایک مرتبہ ہم نے کہا شاہ جی آپ پڑھتے وڑھتے کچھ بھی نہیں یہ آپکا محض نفسیاتی حربہ ہے تو مسکرا کر فرمایا تم بھی یہ حربہ استعمال کر کے دیکھ لو۔

آپکی معجز بیانی کا یہ کمال تھا کہ جس طرح کوئی شہسوار بپھرے ہوئے گھوڑے کو رام کر لیتا ہے اس طرح بگڑے ہوئے مجمع کو قابو کر لیتے اور لوگوں کے دل جیت لیتے تھے۔ کھروڑ کے علاقے میں ایک قصبہ ہے رانے واہن۔ وہاں احرار کا جلسہ تھا یہ پورا علاقہ بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کا علاقہ ہے اس کے قریبی مواضعات میں جو ئیہ برادری کی ہزاروں مربعہ اراضی واقع ہے۔ ان زمینداروں کو احرار کارکنوں کی یہ جسارت ناگوار گزری کہ یہاں ان کی اجازت و مرضی کے بغیر جلسہ منعقد ہو رہا تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ قاضی احسان احمد شجاع آبادی کی تقریر میں کچھ زیادہ ہی تلخی آگئی جس پر وہ لوگ بپھر گئے اور جلسہ کا بائیکاٹ کر کے کچھ فاصلے پر جا کر بیٹھ گئے۔ شاہ جی نے اپنی تقریر اس تمہید کے ساتھ شروع کی۔

"ہم لوگ اسلام کے جاروب کش ہیں دینی مسائل کے ذریعے لوگوں کے دلوں پر جمنے والے اس گرد و غبار کی صفائی ہمارا فریضہ ہے جو گناہ و معصیت یا غفلت و جہالت کی وجہ سے دلوں کو آلودہ کر دیتا ہے۔ قاضی احسان نے جذبات میں آکر عجلت سے کام لیا ہے اس لئے اس کے جھاڑو سے اٹھنے والی گرد نے آپ

کے کپڑے میلے کر دیے ہیں۔ میں تجربہ کار صفائی کنندہ ہوں پہلے پیار و محبت کے پانی سے اس مٹی کو گیلا کروں گا، پھر جھاڑو چلاؤں گا انشاء اللہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"

اتنا سننا تھا کہ بپھرا ہوا مجمع سید عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا پنڈال میں آگیا۔

شاہ جی کا پیغام، پیغامِ محبت تھا جب کبھی ان کی تقریر کے دوران کوئی معترض بول پڑتا اور اس کا لہجہ سخت بھی ہوتا تو شاہ جی کمال شفقت و مہربانی سے پیش آتے۔ ایک مرتبہ میلسی میں آپ کی تقریر جاری تھی کہ کرم پور کا ایک کمہیار جو ملنگ کہلاتا تھا کھڑا ہو گیا اور یہاں تک گستاخی کی کہ آپ کو دشمن رسول ﷺ کہہ دیا۔ احرار رضا کار اس پر جھپٹے مگر شاہ جی نے سختی سے روک دیا اور اسے اپنے پاس اسٹیج پر بلالیا اپنی کرسی کے پاس بٹھا کر فرمایا کہ تقریر سے فارغ ہو کر آپکی بات سنوں گا پھر چشم فلک نے یہ منظر دیکھا کہ وہ شاہ جی کے خطاب کے دوران بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا اور بار بار شاہ جی کے پاؤں چومنے کی کوشش کرتا۔ ہم لوگوں نے اسے بڑی مشکل سے سنبھال رکھا تھا۔

سفر کے دوران بھی آپ سے کئی لوگ ٹکرائے۔ جہاں ہزاروں مسافر آپ کو گاڑی میں موجود پا کر اظہار عقیدت کیا کرتے تھے وہاں کئی مخالفوں سے بھی آمنا سامنا ہو جاتا تھا۔ ہم نے بارہا ان لوگوں کی آنکھوں میں نفرت کے رنگ کو محبت کی قوس قزح میں بدلتے دیکھا۔ آپ نے پوری زندگی ریلوے کے تیسرے درجے میں سفر کیا عقیدت مند لوگ آپ کے لئے اونچے درجے کا ٹکٹ لے لیتے تو آپ اسے واپس کر دیتے۔ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ کراچی سے روانگی کے وقت کسی دوست نے سیکنڈ کلاس کا ملتان تک کا ٹکٹ لا دیا تھا مجبوراً مجھے بھی آمادہ ہونا پڑا راستے میں جہاں جہاں گاڑی رکتی پیٹ فارم پر لوگوں کو بھاگ دوڑ میں مصروف دیکھتا تو یک گونہ عجب کا احساس ہوتا کہ میں آرام سے بیٹھا ہوں اور یہ بے چارے سیٹیں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ فرماتے کہ وہ دن اور آج کا دن میں نے تہیہ کر لیا کہ پھر کبھی اونچے درجے میں سفر نہیں کروں گا تاکہ احساس تفاخر سے دل محفوظ رہے۔

ایک واقعہ یاد آیا کہ شاہ جی حیدر آباد سندھ سے لاہور کے لئے روانہ ہوئے ہم بھی آپکے ہمراہ تھے یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب تحریک پاکستان عروج پر تھی مسلم لیگ کے ایک سرگرم رکن اور ہمارے عزیز دوست منشی عبدالحمید مرحوم بہاولپور کے لئے رحیم یار خاں سے اسی ڈبے میں سوار ہوئے جس میں شاہ جی موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر منشی صاحب کترانا چاہ رہے تھے کہ ہم پر ان کی نظر پڑی۔ شرماتے لجاتے ہمارے پاس آگئے۔ ہم نے حضرت سے ان کا تعارف کرایا باتوں باتوں میں منشی صاحب نے طنز کیا کہ شاہ جی آپ لوگوں نے زندگی بھر قیدیں کاٹیں مگر انگریز کو ہندوستان سے نہ نکال سکے۔ شاہ جی مسکرائے اور سودا کا یہ قطعہ پڑھا

سودا قمارِ عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا

کس مُنہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

شاہ جی کا شعری ذوق بے حد ارفع و اعلیٰ تھا۔ ایک تقریر کے دوران ختم نبوت کے موضوع پر دلائل دے رہے تھے کہ غالب کا یہ شعر آپکی زبان پر آگیا۔

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ بتلاؤ کہ بتلائینگے کیا

فرمانے لگے کہ علوم و معارف کا سارا خزانہ تو حضور نبی کریم ﷺ لٹا کر جا چکے اب کوئی نیا نبی آئے بھی تو کیا کریگا اور کیا کہے گا؟ اس سے پاس بتانے کو کیا ہوگا؟

یقین فرمائیے کہ ہم غالب کے پرستاروں اور اس کے کلام کو سمجھنے کے دعویداروں میں خود کو شمار کرتے ہیں مگر غالب کے اس شعر کی جو تشریح شاہ جی نے کی اس پر ہم ششدر رہ گئے۔

رہبر عاشقانِ پاک سرشت

دل بشورید و چشمِ من بجکید — دوش چوں نغمۂ ندیم شنید
رہبرِ عاشقانِ پاک سرشت — شاہدِ عاشقانِ بزمِ وحید
یادِ لحنش زمن ربود دلم — مرغِ اندیشہ ام زلانہ پرید
شد چناں مشتعل بدل آتش — جوش زد خون و، قطرہ قطرہ چکید
شد سکون از دلم زِ یادِ رُخش — مضطرب گشت و ہوش و صبر رمید
اندریں بے خودی شنیدم من — نغمۂ کزروانِ من بجکید
اے خوش آں کس کہ برد رش برسید — در حریمش حضور او بتپید
دست بردار شد زِ ہر دو جہاں — جان و سرداد و عشقِ او بمزید
خویش را کرد بہرِ اُو ویراں — جامۂ عقل پارہ پارہ درید
فارغ از "نیل" و "سلسبیل" آمد — ہر کہ یک جرعہ از حرش بچشید
ہست برتر ہزار بار زگل — خارِ عشقش کہ دردلم بخلید
جانِ ناسک بہ رقص و وجد آمد — چوں پیامش خود از ندیم شنید

(میر غلام نبی ناسک امرتسری)